Taṣdīq
Vol 6 No 2, 2024

تصدیق

Article

The Tradition of Punjabi Sufi Poetry

پنجابی صوفیانہ شاعری کی روایت

Dr. Nadia Anjum[1], Dr. Riaz Ahmad Riaz[2], Shumaila Majeed[3]
[1]Assistant Professor, Department of Urdu, Government Associate College for Women Ayub Research Faisalabad, [2]Visiting Lecturer, Department of Urdu, Government College University Faisalabad, [3]Visiting Lecturer, Government Islamia Graduate College for Women, Eid Gah Road, Faisalabad
Correspondence:naadiaanjum@gmail.com

[1]ڈاکٹر نادیہ انجم، [2]ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، [3]شمائلہ مجید

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، ایوب ریسرچ، فیصل آباد، [2]وزٹنگ لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، [3]وزٹنگ لیکچرار، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج برائے خواتین، عید گاہ روڈ، فیصل آباد

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

DOI:https://doi.org/10.56276/9gxa5n43

Received:16-10-2024
Accepted:24-12-2024
Online:30-12-2024

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2024 by the authors.

ABSTRACT

The appeal of Sufi poetry is universal, as it has deep roots and a close creative bond with mankind. Sufis are lovers of the truth. Through love and devotion, they seek to become one with their beloved. Through poetry, many of the great Sufi mystics have been able to encapsulate and share their spiritual experiences. Punjabi, as being the major language of the subcontinent, attracted more poets than any other. So, Sufi poetry runs deep in the roots of this culture. This article sheds some light on the history and traditions of Sufi poetry.

KEYWORDS:
Sufi Poetry, Universal Appeal, Spiritual Experiences, Punjabi Culture, Mystical Traditions

اگر ہم تصوف کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مطابق تصوف کا آغاز نبی کریم ﷺ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ہو گیا تھا۔ تصوف کا مسلک اپنانے والوں میں عبادت و ریاضت کے رجحانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور

اس راہ پر چلنے والے لوگ قرآنی آیات پر عام لوگوں کی نسبت زیادہ سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہی وہ رجحانات تھے جنھوں نے تصوف کا روپ دھارا۔ اور جو لوگ اس راستے کو اپناتے انہیں صوفی کہا جانے لگا۔ ان کو صوفی کہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ سوت کے کپڑے پہنتے تھے جسے "صوف" کہا جاتا تھا جو لوگ دنیا سے کنارہ کشی کر کے دن رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔

برصغیر میں اسلام کی آمد کے بعد بعض صوفیا کرام نے یہاں تبلیغ کا آغاز کیا۔ یہ صوفیا کرام اپنے عمل سے لوگوں کو مسلمان بنانے میں مصروف رہے اور ان کے صبر، بردباری اور پیار و محبت نے پنج ذات کے لوگ (جنہیں اعلیٰ ذاتوں نے دھتکارا ہوا تھا) ان کے مرید ہونے لگے۔ لیکن پنجاب کے حالات کی وجہ سے صوفی ازم میں بھی بہت سی تبدیلیوں رونما ہوتی رہیں۔

> "بہت سے صوفیاء نے تبلیغ کا کام ترک کر دیا۔۔۔ اور خود کو اس دیس کے مختلف مذاہب اور فلسفوں کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا۔ میاں میر، شہزادہ دارہ شکوہ، ابوالفضل اور فیضی وغیرہ اسی قبیل کے صوفی تھے۔"(۱)

ہندوستان کی حکومتیں بھی تصوف پر خاصی اثر انداز ہوئیں۔ ستارہویں صدی کے آخر میں ملکی حالات کی بدولت تصوف میں مزید تبدیلیاں آ ئں۔ یہاں کے بادشاہ اورنگ زیب کی تنگ نظری نے عوام اور صوفیا کرام کو مذہب سے کچھ بددل کر دیا اور وہ ہندو ویدانیت کی طرف راغب ہوئے۔ اس سے پہلے پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور اعمال کو صوفی ایک بہترین نمونہ سمجھتے ہوئے اس پر چلتے تھے۔ ہندو اور بت پرستی کو بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سترھویں صدی میں بت پرستی کی مذمت کم ہوتی گئی اور صوفیا نے اسے بھی اللہ تعالیٰ کے قرب اور پیار کا وسیلہ سمجھنا شروع کر دیا۔ اکثر صوفیا کرام نے کھانے میں گوشت سے بھی پرہیز کرنا شروع کر دیا اور مذہبی تعصب کی بھی مذمت کرنے لگے اور وہ لوگ مذہبی آزادی کے بھی قائل تھے۔ تصوف کے اس ارتقائی دور میں صوفیا کرام کے علیحدہ علیحدہ گروہ بھی سامنے آنے لگے۔ اس وقت پنجاب میں تین بڑے صوفی گروہ تھے۔ پہلا گروہ شرعی خیالات والے صوفیا کا تھا۔ یہ صوفیا مذہبی تبدیلی کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنانا ان کے نزدیک بُری بات نہیں تھی۔ یہ قرآن کو سب سے بڑی آسمانی کتاب اور محمد ﷺ کو خدا کا آخری پیغمبر مانتے تھے۔ یعنی یہ لوگ اسلامی عقیدے کے پابند تھے۔ لیکن دوسرے مذاہب کو بھی کھلے دل سے تسلیم کرتے تھے۔ ان صوفیا میں علی حیدر اور فرید ثانی کے نام زیادہ اہم ہیں۔ دوسرا گروہ ایسے صوفیا کا تھا جو فلسفیانہ خیالات کے حامل تھے۔ یہ صوفیا بھی مذہبی تفاوت کو نہیں مانتے تھے اور فکر و سوچ و بچار کرنے والے تھے۔ بقول ڈاکٹر لاجونتی رام کرشن:

> "وہ مقام مذاہب کی بے جا پابندیوں اور خشک اصولوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور ہمہ اوست والے تصوف کو نمایاں اوصاف کے ساتھ پیش کرتے تھے۔"(۲)

ان مکتبہ فکر والے صوفیاء کرام میں بلّھے شاہ کا نام نمایاں ہے جنھوں نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب کیا۔ تیسرا گروہ ایسے صوفیا کا ہے جو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ یہ صوفیاء کچھ کٹر قسم کے تھے اور ان کی مقبولیت نچلے طبقے کے لوگوں میں زیادہ تھی۔ یہ لوگ وقت کے ساتھ بدلنے والے اور حالات و واقعات کے ساتھ پلٹا کھانے والے تھے ۔اس لیے کہ ہر مذہب کے لیے خطرہ ہی تھے۔ اس گروہ بندی سے بالاتر تمام صوفیا نے امن و آشتی کا درس دیا۔

ہندوستان کے صوفیا نے آغاز میں فارسی زبان کو وسیلہ ءشاعری بنایا۔ ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی اور تقریباً ہر جگہ ہی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن عوام سے قرب کا طریقہ تو یہ ہے کہ ان کی زبان میں بات کی جائے۔ اسی مقصد کے تحت صوفیا نے مقامی زبانوں میں لکھنا شروع کیا۔ پندرھویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب کے صوفیا نے پنجابی کو ذریعہ ء اظہار بنایا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ ہاشمی لکھتے ہیں:

> ”یہ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے اسی زبان کو ذریعہ ءکلام بنایا کیونکہ وہ عربی یا فارسی کے عالم تھے اور یہاں کے لوگ (یعنی لاہور اور اس کے قرب و جوار کے لوگ) یا تو سنسکرت جانتے تھے یا یہ زبان۔ اس لیے انھوں نے اسی زبان کو ذریعہ ءاظہار بنایا ہوگا۔ جو یہاں کے باشندوں کی سمجھ میں آتی تھی۔“(۳)

بعد میں آنے والے صوفیا نے اسی طرز کو اپنایا اور پنجابی میں صوفیانہ شاعری کی ایک اچھی روایت قائم ہوئی۔ پنجابی کی صوفیانہ شاعری میں خدا کی ذات ہی تمام تعریفوں کا منبع ہے اور لوگ فنا فی الشیخ کی منزل طے کرتے ہوئے فنا فی الرسول کی منزل پر پہنچتے ہیں اور یہ تمام راستہ اللہ کی ذات میں فنا کے لیے طے کرتے ہیں۔ یہ انسان فنا ہو کر اللہ کی ذات میں شامل تو موت کے بعد ہی ہو سکتا ہے لیکن صوفی یہ منزل زندگی میں ہی تلاش کرتے ہیں اور اسی لیے وہ خدا کو اپنا محبوب گردانتے ہیں۔ زیادہ تر صوفی شعراء نے خدا کی ذات کو مرد محبوب کے روپ میں اور اپنے آپ کو ہجر کی ماری ہوئی عورت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ صوفی شعراء نے ذریعہ ءاظہار کے لیے جن اصناف کا انتخاب کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کافی

(۲) بارہ ماہ

(۳) اٹھوارہ

(۴) سی حرفی

(۵) قصہ

(۶)بیت

(۷)دوہڑہ

(۸)وار

(۱)کافی

پنجابی صوفیانہ شاعری میں کافی ایک اہم صنف سخن ہے۔اس حوالے سے خان صاحب قاضی فضل الحق لکھتے ہیں:

"ایک خاص قسم کی نظمیں جنہیں کافی کہا جاتا ہے اسی مضمون کے لیے مخصوص ہیں۔اس صنف میں سب سے پہلے مصنف شاہ حسین معاصر اکبر ہیں۔"(۴)

کافی میں موسیقت پائی جاتی ہے اور اسے عام طور پر خدا کی شان اور دیگر صوفیانہ مضامین کے بیان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۲)بارہ ماہ

اس صنفِ سخن میں پنجابی سال کے بارہ مہینوں کا ذکر ہجر ووصال کے مضامین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔یہ صنف سخن بھی تقریباً ہر صوفی شاعر نے استعمال کی۔

(۳)اٹھوارہ

یہ صنفِ سخن آٹھ دنوں کی کہانی پر مشتمل ہوتا ہے جس میں شاعر محبوب (خدا) کے ہجر ووصال کی کہانی بیان کرتے ہیں۔

(۴)سی حرفی

سی کا مطلب فارسی میں تیس (۳۰) ہے۔اس سے مراد ایسی صنف ہے جس میں حروفِ تہجی کی ترتیب کو سامنے رکھ کر نظم لکھی جاتی ہے۔ تقریباً تمام صوفیا کرام نے اس صنفِ سخن کو بھی اپنایا لیکن اس میں سب سے زیادہ شہرت حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کے حصے میں آئی۔سی حرفی کا ہر بند جو نئے حرف سے شروع ہوتا ہے۔ایک علیحدہ نظم ہی محسوس ہوتی ہے۔

(۵)قصہ

اس صنفِ سخن میں ایک پوری کہانی نظم کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ "ہیر رانجھا" یا قصہ "سیف الملوک"۔اس طویل نظم میں ایک کہانی بیان کی گئی ہوتی ہے۔یہ قصہ کچھ اشلوک اور کچھ ابیات کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔

(۶)بیت

بیت دو مصروں کا شعر ہوتا ہے اس کے کوئی مخصوص اصول متعین نہیں ہیں لیکن یہ صنف بھی صوفیانہ شاعری میں استعمال ہوتی رہی ہے۔

(۷)دوہڑہ

دوہڑہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں چار مصرعے ہوتے ہیں اور سب ہم قافیہ ہوتے ہیں۔یہ صنف ہمیں سب سے زیادہ ہاشم شاہ کے ہاں نظر آتی ہے۔

(۸)وار

وار سے مراد ایسی نظم ہے جس میں جنگ کے دوران شہید ہونے والے بہادروں کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔یعنی یہ مرثیہ سے ملتی جلتی صنف ہے لیکن بعد میں اس صنف میں مذہبی شخصیات کی شان میں بھی لکھا جانے لگا۔

پنجاب کے تمام صوفیا کرام کی شاعری ہمیں انہی اصناف میں ملتی ہے اور یہ شاعری ہمارے زبان و ادب کا ایک اہم ورثہ ہے۔پنجابی صوفیانہ مضامین سب سے پہلے بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی شاعری میں ملتے ہیں۔اسی لیے انہیں پنجابی صوفیانہ شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں خدا کی محبت اُجاگر کی۔یہ ان صوفیا کرام میں سے ہیں جنہوں نے مذہب سے بالاتر خیالات پیش کئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سکھوں کی مذہبی کتاب "گروہ گرنتھ" میں موجود ہے۔انھوں نے اپنے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے لیے مقامی زبان کا سہارا لیا۔سید سبطین گیلانی لکھتے ہیں:

> "حضرت بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ۔۔۔۔۔نے زبان و بیان میں ہندی، پنجابی، ملتانی اور ابتدائی اُردو کے الفاظ عوام الناس تک محبت کا پیغام پہنچانے کیلئے بغیر کسی لسانی عصبیت کے استعمال کئے۔"(۵)

بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ سلسلہء چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ جیسے مرشد سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے پنجاب کے باسیوں کے لیے روشنی کے نئے در کھولے۔وہ زیادہ عرصہ پاک پتن میں رہے اور وہیں دفن ہوئے۔یہ علاقہ اس دور میں کچھ خاص ترقی یافتہ نہیں تھا اور یہاں کے لوگ علم و ادب میں کافی پیچھے تھے۔انہوں نے یہاں اپنا مسکن بنایا اور شب و روز عبادت و ریاضت کے ساتھ عوام کو بھی علم کی روشنی سے فیض یاب کیا۔انہوں نے اپنی شاعری سے لوگوں کو توکل اور قناعت کی تعلیم دی۔

رُکھی سُکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی(٦)

فریدا! روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ
جنہاں کھاہدی چوپڑی گھنے سہن گے دُکھ(٧)

بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے بعد دوسرے بڑے صوفی شاعر شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ ہیں جن کا تعلق لاہور سے تھا اور انھوں نے صرف دس(١٠) سال کی عرصے میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ وہ شیخ بہلول چنیوٹی کے مرید تھے اور انہی کے کہنے پر شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ نے داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر بھی کافی وقت گزارہ۔ شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ نے کئی برس تک ریاضت کی پھر چھتیس(٣٦) برس کی عمر میں شیخ سعد اللہ کی شاگردی اختیار کی۔ ایک قرآنی آیت کو پڑھتے ہوئے ان کے ذہن کی کایہ کلپ ہو گئی اور وہ مجذوبیت کے عالم میں سب عبادات کو چھوڑ چھاڑ کر ملامتیہ فرقہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے روایتی انداز کی شرم شرع چھوڑ کر گانا، ناچنا اور شراب پینا شروع کر دیا۔ حسین قادری کے سلسلے سے منسلک تھے۔ انہیں موسیقی اور ناچ گانے سے دلی لگاؤ تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں بھی موسیقت پائی جاتی ہے۔ وہ شاعری میں "کافی" کے موجد مانے جاتے ہیں اور کافی ایسی صنفِ سخن ہے جس میں موسیقت پائی جاتی ہے۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال
دُکھاں دی روٹی، سولاں دا سالن، آہیں دا بالن بال
مائے نی میں کنوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال(٨)

میں وہ جھوک رانجن دی جانا نال میرے کوئی چلے
پیریں پوندی منتاں کر دی، جانا پیا مینوں کلے(٩)

شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے دور کے بگڑے ہوئے معاشی، سماجی اور اخلاقی نظام کی اصلاح کے لیے بلند و بالا محلوں میں رہنے والے لوگوں کو اپنی شاعری کے ذریعے یہ یاد دلایا کہ انہیں ہمیشہ دنیا میں نہیں رہنا۔ اس لیے دوسری دنیا کی فکر ضروری ہے۔ انھوں نے بھی دوسرے صوفی شعراء کی طرح عمل پر زور دیا اور انھوں نے بڑی سے بڑی بات کو بھی مختصر انداز میں پیش کیا اور یہی ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔

شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ کے بعد پنجابی صوفیانہ شاعری میں تیسرا بڑا نام حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کا بچپن شور کوٹ ضلع جھنگ میں گزرا اور پنجاب کے مختلف حصوں کے سفر سے آپ نے مختلف لوگوں سے فیض حاصل کیا۔ انھوں نے زیادہ وقت شور کوٹ میں ہی گزارا اور اسی علاقے کے لوگوں کے دلوں میں علم و فضل کی شمعیں روشن کیں۔ انہوں نے ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں لکھیں لیکن ان کی اصل مقبولیت ان کی ابیات کی وجہ سے ہے جو کہ سی حرفی کی شکل میں ہیں۔ ان کی شاعری پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک فلسفی صوفی شاعر تھے۔ مگر انھوں نے اپنا فلسفہ شریعت کے پردے میں چھپا کر پیش کیا۔ ان کی شاعری بہت سادہ ہے۔ اس میں کوئی بناوٹی عنصر محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں ہر مصرعے کے بعد "ہو" آتا ہے۔ یہ "ہو" اصل میں اللہ کا صفاتی نام جانا جاتا ہے۔ اور اس کا ورد بہت برکت والا سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں اسے ردیف کے طور پر استعمال کیا۔ سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کو سی حرفی کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے تمام حروفِ تہجی کے تحت ابیات لکھے ہیں۔ کسی کسی حرف کے آغاز سے تو بیس (۲۰) کے قریب ابیات بھی ملتی ہیں۔

ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد ویکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ چشماں اِک کھولاں اِک کجاں ہو
ایتناں ڈٹھیاں صبر نہ ہووے ، ہور کتے ول بھجاں ہو
مرشد دا دیدار ہے باہو مینوں لکھ کڑوڑاں حجاں ہو(۱۰)

ایہہ تن رب سچے دا حجرہ ، دل کھڑیا باغ بہاراں ہو
وچ کوزے وچ مصلے ، وچ سجدے ہزاراں ہو
کعبہ وچ قبلہ وچ الا اللہ پکاراں ہو
کامل مرشد ملیا باہو ، او آپ لِسی ساراں ہو(۱۱)

یہ "ہو" اصل میں اللہ کا صفاتی نام جانا جاتا ہے۔ اور اس کا ورد بہت برکت والا سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں اسے ردیف کے طور پر استعمال کیا۔ سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کو سی حرفی کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے تمام حروفِ تہجی کے تحت ابیات لکھے ہیں۔ کسی کسی حرف کے آغاز سے تو بیس (۲۰) کے قریب ابیات بھی ملتی ہیں۔

پنجابی صوفیانہ شاعری میں سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ نے بعد اگلا بڑا نام بابا بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا۔ بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کو پنجابی ادب کا بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کی کافیاں زبان زدعام ہیں اور ان کا فکر سلسلہ جلال الدین رومی اور شاہ شمس تبریز سے ملتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کا بچپن ضلع لاہور کی تحصیل قصور کے ایک گاؤں پانڈو میں گزرا۔ وہ سید زادے تھے۔ جب بڑے ہوئے تو روحانی تعلیم کے لیے لاہور کا سفر کیا۔ وہاں شاہ عنایت رحمتہ اللہ علیہ سے ملے اور ان کے مرید ہو گئے۔ بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ، شاہ عنایت رحمتہ اللہ علیہ سے حد درجہ متاثر تھے اور ان کی عظمت کے گرویدہ تھے۔ اسی لیے بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی شاعری میں جابجا ان کے مرشد کا ذکر نظر آتا ہے۔ لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ وہ سید زادے ہیں جو کہ خود پیروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں انہیں ایک ارائیں کو مرشد نہیں بنانا چاہیے لیکن بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا کہنا تھا:

جیہڑا سانوں سید اَکھے دوزخ ملن سزائیاں
جیہڑا سانوں رائیں آکھے بہشتیں پینگھاں پائیاں (۱۲)

ان کی اس لگن اور محبت کو دیکھتے ہوئے خاندان والے اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ گئے اور ان سے قطع تعلق کر لیا۔ بلّھے شاہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ انھوں نے نہایت بے باکی اور خالص انداز میں اپنے خیالات کی تبلیغ کی۔ اس سے پہلے کے صوفیاء کے ہاں بھی باغیانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے لیکن وہ اظہار دبے لفظوں میں ہے جبکہ بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے جس بے باک اور نڈر انداز میں عشقِ حقیقی کے راز عیاں کئے وہ پہلے کسی صوفی شاعر نے نہیں کئے۔

نہ میں بھید مذہب دا پایا
نہ میں آدم حوّا جایا
نہ میں اپنا نام دھرایا
نہ وچ بیٹھن نہ وچ بھون
بلھیا کی جاناں میں کون (۱۳)

شاہ عنایت کی وفات کے بعد وہ قصور آ گئے۔ انہوں نے اپنے مرشد سے وفاداری نبھائی اور ساری عمر شادی بھی نہیں کی۔ قصور میں انتقال فرمایا اور یہیں دفن ہوئے۔

صوفی شاعر علی حیدر ملتانی رحمتہ اللہ علیہ ملتان میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ضلع ملتان کے گاؤں قاضیاں میں گزارا۔ ان کو دیگر بڑے صوفی شعراء کے جتنی شہرت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن ان کا کلام فقراء اکثر گنگناتے ہوئے ملتے ہیں۔ لاہور کے ملک فضل دین نے بہت تحقیق کے بعد ان کے کلام کو اکٹھا کرنے کی سعی کی۔ ان کو ان کی اولاد سے کافی

معلومات بھی ملیں اور ان کا قلمی نسخہ بھی ملا جسے انھوں نے ’’مکمل مجموعہ ابیات علی حیدر‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ علی حیدر رحمتہ اللہ علیہ شاہ محی الدین کے پیروکار تھے جو علم و فضل میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اور آپ سلسلہ قادریہ کے بانی تھے۔ان کے عقیدت مند تقریباً پنجاب کے ہر حصہ میں ملتے ہیں۔ علی حیدر کی شاعری میں الفاظ کا چناؤ بہت خوبصورت ہے۔

ش شراب دے نال مست رہن کیہ نین تینڈے متوالڑے نی
سرخ ، سفید دنبا لڑے باجھ کجل کیویں کالڑے نی(۱۴)

علی حیدر کا انداز دوسرے تمام شعراء میں نمایاں نظر آتا ہے جس میں ایک خاص قسم کی خوبصورتی اور شان پائی جاتی ہے۔انہوں کے ’’قصہ ہیر رانجھا‘‘ بھی لکھا ہے جو کہ مکمل نہیں۔اپنی شاعری میں انھوں نے غیر ملکی زبان کے الفاظ اور محاورے اس خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں کہ وہ پنجابی ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔

جان بچا کے باجھوں چاکے رکھیں کیونکر ہوئی ما
یحرق ماسویٰ المحبوب رہیا غیر نہ کوئی ما
وہ وچ آکھے دیکھ تماشا ہے جے اوتھے ڈھوئی ما
من ہو مقناطیسی حیدر اوسے دی کھچ رکھوئی ما(۱۵)

اس بند میں ’’یحرق ماسویٰ المحبوب‘‘ اور ’’من ہو مقناطیسی‘‘ عربی کے الفاظ ہیں جو ذرا بگڑی ہوئی صورت میں ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری پنجابی کی صوفیانہ روایت میں اہم مقام رکھتی ہے۔

وارث شاہ رحمتہ اللہ علیہ پنجابی کے صوفی شاعروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔وہ جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے۔انھوں نے ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے قصور تک کا سفر کیا اور وہاں مخدوم غلام مرتضیٰ قصوری کے مدرسے میں داخل ہوئے۔بلّھے شاہ نے بھی اسی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔یہاں سے انہوں نے پاکپتن کا رُخ کیا اور بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے دربار پر حاضری دی۔وہاں سے واپسی پر ملکہ ہانس کے ایک قصبے میں امام مسجد بنے۔یہی وہ جگہ تھی جہاں انہوں نے اپنا شاہکار قصہء تخلیق کیا۔ اسی جگہ کے حوالے سے روایت ہے کہ انہیں ’’بھاگ بھری‘‘ نامی لڑکی سے عشق ہوا۔ان کے قصہ ہیر رانجھا میں بھی بھاگ بھری کا نام چھ (۶) جگہ پر آتا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کسی بھاگ بھری کو مخاطب کیا گیا یا ہیر کو ہی ’’بھاگاں والی‘‘ کہا گیا ہے۔ہیر وارث شاہ کا وارث شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔اس کا سب سے پرانا نسخہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

پنجاب میں ہیر وارث شاہ کی مقبولیت کی پیش نظر بہت سے پبلشرز نے اسے شائع کیا اور اپنی کتاب کو دوسروں سے نمایاں کرنے کے لیے اس میں بکثرت نئے اشعار کا اضافہ کر دیا جس سے اصلی ہیر کہیں دب سی گئی۔اس کے بعد کافی محققین نے اسے دوبارہ اصلی شکل میں لانے کی کوشش کیں۔ان محققین میں باوا بدھ سنگھ، ایس، ایس امول، اے۔کے لکھن پال، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، عبدالعزیز، شمشیر سنگھ اشکوک، ڈاکٹر جیت سنگھ سیتل، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، سنت سنگھ، سیکھوں اور محمد شریف صابر نے بہت کام کیا اور ہیر وارث شاہ کے اصل اشعار کو مرتب کر کے شائع کیا۔وارث شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے ہیر کے علاوہ قصیدہ بردہ شریف کا پنجابی منظوم ترجمہ کیا اور قصہ سسی پنوں، سی حرفیاں اور دوہڑے بھی لکھے لیکن مقبولیت ان کی لکھی ہوئی ''ہیر'' کے حصے میں آئی۔

روح چھڈ کلبوت جیوں وداع ہوندا انویں ایہ درویش سدھاریا ای
ان پانی ہزارے دا قسم کر کے قصہ جھنگ سیال چتاریا ای
کیتا رزق تے آب اُداس رانجھا چلو چلی جیو پکاریا ای
کچھے ونجلی مار کے رواں ہویا وارث وطن تے ایس وساریا ای(۱۶)

سانوں دس نماز ہے کاس دی جی کاس نال بناء کے سیاریا نیں
کن نک نماز دے ہین کتنے متھے کہناں دے دُھروں ایہ ماریا نیں
لمبے قد چوڑی کس ہان ہندی کس چیز دے نال سواریا نیں
وارث کلیاں کتیناں اُس دیاں نیں جن نال ایہ نبھ اتاریا نیں(۱۷)

وارث شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے ہیر کی صورت میں ایک لافانی ادبی شاہکار تخلیق کیا۔انھوں نے اس کہانی کو روح اور کلبوت کا قصہ کہا ہے اور اگر وہ اسے سادہ کہانی بھی کہتے تو بھی یہ اتنا ہی بڑا شاہکار ہوتا۔

ہاشم شاہ ضلع امرتسر کے گاؤں جگ دیو میں پیدا ہوئے۔انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔انہوں نے چھوٹی عمر میں ہی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور اپنی اسی خوبی کی بدولت وہ اپنے زمانے کے شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ان کے متعلق روایت ہے کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری شاعر تھے۔لیکن اس کے متعلق کوئی حتمی رائے دستیاب نہیں ہے۔ہاشم شاہ سادگی پسند صوفی تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے اکثر تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا اور اُردو میں ان کے کلام کے زیادہ تراجم بھی نہیں ہوئے۔لیکن ان کے کلام میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو انہیں پنجابی صوفیانہ شاعری کی روایت میں اہم مقام دیتی

ہیں۔ ہاشم شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی سب سے مشہور کتاب "سسی پنوں" ہے۔ حالانکہ یہ قصہ پہلے بھی کچھ لوگ لکھ چکے تھے لیکن ہاشم شاہ نے اس میں نئی روح پھونک دی۔ ان کا قصہ ان پرانے قصوں سے بالکل الگ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے زیادہ توجہ سسی پنوں کی محبت کو بیان کرنے پر دی ہے جبکہ دوسرے شاعروں نے رواجوں، گروہوں کے اختلافات شادی بیاہ کی رسموں وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔

اوڑک وقت قہر دیا کو کاں سن پتھر ڈھل جاوے
جس ڈاچی میرا پنوں کھڑیا شالا اوہ دوزخ وچ جاوے
یا اس نیہوں لگے وچ برہوں وانگ سسی جر جاوے
ہاشم موت لوے کروانا تخم زمینوں جاوے(۱۸)

ہاشم شاہ نے اس روایتی قصے کو خوبصورت زبان و بیان سے شاہکار بنادیا ہے اور اپنے صوفیانہ خیالات کو جابجا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان کے اصل صوفیانہ خیالات ہمیں ان کے دوہڑوں میں نظر آتے ہیں۔

رب دا عاشق ہون سکھالا ایہہ بہت سکھالی بازی
گوشہ پکڑا رہے ہو صابر ، پھڑ تسبیح بے نمازی
سکھ آرام جگت وچ سوبھا اتے ویکھ ہووے جگ راضی
ہاشم خاک رلاوے گلیاں ایہہ کافر عشق مجازی(۱۹)

پنجابی صوفیانہ شاعری میں ایک اور بڑا نام میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جنہوں نے قصہ سفر العشق لکھ کر سیف الملوک کے عشق کے قصہ کو امر کر دیا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ یہ قصہ ہیر رانجھا، سسی پنوں اور مرزا صاحباں کی طرح مقبول تو نہ ہو سکا لیکن اس میں پیش کئے گئے میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ کے خیالات زبان زدِ عام ہو گئے۔ ان کے اکثر شعر اقوال کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میاں صاحب میرپور آزاد کشمیر کے خوبصورت علاقہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت غلام محمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور تصوف کو اپنا راستہ چنا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے نفس کی پاکیزگی کے لیے بہت سخت قسم کے مجاہدے بھی کئے۔ اسی لیے ان کی داستان، سفر العشق، محض عشق کا سفر نہیں بلکہ تصوف کا سفر بھی ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنے دور کے سیاسی حالات سے بھی متاثر ہوتا ہے اور میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان کے حالات کافی دگر گوں تھے۔ انگریزوں کی حکومت یہاں قائم ہو رہی تھی اور مسلمان تخت و تاج سے

غلامی کی طرف سفر کر رہے تھے۔ ان کا قصہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھا گیا۔ شاید اس لیے اس قصے میں آزادی کی تڑپ اور غلامی سے نجات کے اثرات نظر آتے ہیں۔

جھل جھل ہار نہ ہاریں ہمت ، ہک دن پھر سی پاسا
بُھکھا منگن چڑھے محمد اوڑک بھر سی کاسا(۲۰)

اسی طرح ان کی شاعری میں ہمیں بہت سی سبق آموز باتیں بھی ملتی ہیں۔

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
ککر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا(۲۱)

دشمن مرے تو خوشی نہ کریے سجناں وی مر جانا
ڈیگر تے دن آیا محمد اوڑک نوں ڈب جانا(۲۲)

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری
یار ملے دُکھ جان ہزاراں شکر کراں لکھ واری(۲۳)

پنجابی صوفیانہ شاعری کی روایت کے آخری بڑے شاعر خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ صوفیانہ شاعری کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ وہ میاں خدا بخش رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں چاچڑاں شریف ضلع خانپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام پہلے خورشد عالم رکھا گیا تھا لیکن پھر حضرت فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت سے غلام فرید رکھا گیا۔ اور آپ کو اسی نام سے شہرت ملی۔ وہ چار برس کے تھے جب ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا اور آٹھ برس کی عمر میں والد گرامی بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی خواجہ فخر الدین نے سنبھالی۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ فرید رحمتہ اللہ علیہ اپنے بڑے بھائی سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے اور انہی کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ بڑے بھائی کی وفات کے بعد آپ گدی نشین مقرر ہوئے۔ آپ نے حج بھی کیا اور بہت سے اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت بھی کی۔ آپ کو اُردو، عربی، فارسی، سرائیکی، سندھی اور ہندی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو "شاعرِ ہفت زبان" بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی زبان نہایت سادہ اور میٹھی ہے اور متصوفانہ موضوعات سے پُر ہے۔

میڑا عشق دی توں میرا یار وی توں
میڑا دین وی توں ایمان وی توں
میڑا جسم وی توں میڑی روح وی توں
میڑا قلب وی توں ، جند جان وی توں
میدا کعبہ ، قبلہ، مسجد ، ممبر
مصحف تے قرآن وی توں(۲۴)

کیا حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ ملدا
مُنہ دھوڑ مٹی سر پاتم
سارا ننگ نمود و نجائم
کوئی پچھن نہ ویہڑے آئم
ہتھوں اُلٹا عالم کھلدا(۲۵)

یہ صوفیاء کرام پنجاب میں جو مقصد لے کر آئے تھے کہ ہندوستانیوں کو اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے راستے پر ڈالتے ہوئے محبوبِ حقیقی کی جانب لے جائیں گے۔ وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ لیکن بعد میں وہ یہاں کے مقامی اثرات کے زیرِ اثر آ گئے۔ ان صوفیاء کرام نے اپنے خیالات کو شاعری کا لباس پہنایا اور مختلف فرقوں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی بر قرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے روح پرور کلام کے ذریعے بستی بستی اور گھر گھر امن، اتحاد اور محبت کا پیغام پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے لوگ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایسا خوبصورت اور پاک کلام موجود ہے جو ان میں عشقِ الٰہی کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حمید اللہ ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو اور پنجابی۔لسانی وادبی اشتراک، مشمولہ پاکستانی زبانیں مشترک لسانی و ادبی ورثہ مرتب ڈاکٹر انعام الحق جاوید /عبداللہ جان، اسلام آباد، شعبہ پاکستانی زبانیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء، ص۱۹

۲۔ لاجونتی رام کرشن، ڈاکٹر، پنجابی کے صوفی شاعر، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۴ء، ص۱۷

۳۔ حمید اللہ ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو پنجابی۔ لسانی و ادبی اشتراک، ص ۴۳

۴۔ فضل حق قاضی، خانصاب، مسلمان اور پنجابی لٹریچر مشمولہ، پنجابی علم و ادب میں مسلمانوں کا حصہ، مرتبہ بدلِ حق محمود، لاہور ل، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵

۵۔ سبطین گیلانی، سید، ملتان کی صوفیانہ ساعری، لاہور، پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج آرٹ اینڈ کلچر، ص ۴۵

۶۔ محمد آصف خان، آکھیا بابا فرید نے، لاہور، پنجابی ادبی بورڈ، س ن، ص ۳۳

۷۔ ایضاً، ص ۳۵

۸۔ تاج دین، صوفی، مرتب کلام شاہ حسین، لاہور، علی ہجور پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۰۔ سلطان الطاف علی، ڈاکٹر، مرتب، ابیات باہو معہ ترجمہ و شرح، لاہور، باہو پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۷۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۹

۱۲۔ بلّھے شاہ، کافیاں بلّھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ، مترجم، عبدالمجید بھٹی، اسلام آباد، لوک ورثہ، ۱۹۷۵ء، ص ۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۴۔ علی حیدر، لعل ہیرے، مترجم، غلام رسول حسرت، لائل پور، حسرت سنز اینڈ کمپنی، ۱۹۷۳ء، ص ۸۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۶۔ وارث شاہ، ہیر وارث شاہ، مترجم، محمد شریف صابر، لاہور، محکمہ ثقافت و سیاحت حکومت پنجاب، ۱۹۸۵ء، ص ۴۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۸۔ ہاشم شاہ، سسی پنوں، مترجم، شفیع عقیل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۲۰۔ سبط الحسن ضیغم، سید، مدون، سیف الملوک از میاں محمد بخش تدوین نو، لاہور، پیکیجز لمٹید، ۱۹۹۳ء، ص ۵۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۲۴۔ دلشاد کلانچوی، مرتب، انتخاب دیوانِ فرید، بہاولپور، اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱۴